سیّد علی رضا نقوی: پاکستان کے ایک لائق فارسی تذکرہ شناس اور فائق لُغت نگار

عارف نوشاہی

(۱)

پاکستان و ہند اور ایران میں جو لوگ فارسی تذکروں اور زبان و لغات سے دل چسپی رکھتے ہیں ان کے لیے ڈاکٹر سید علی رضا نقوی (۱۹۳۳-۲۰۱۷ء) (اس کے بعد: ڈاکٹر صاحب) کا نام نہ صرف جانا پہچانا ہے بلکہ معتبر بھی ہے۔ پاکستان کا یہ لائق فارسی تذکرہ شناس اور فائق لغت نگار ۹ دسمبر ۲۰۱۷ء کو لاہور میں ایسی خاموشی سے ہم سے رخصت ہوا[۱] کہ مجھ ناچیز تک کو، جسے ان کی شاگردی اور نیازمندی کا تقریباً نصف صدی شرف حاصل رہا ہے، بروقت خبر نہ ہوسکی! اس پر ستم ظریفی یہ کہ جس روز (۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء) سماجی ذرائع ابلاغ پر ان کی وفات کی خبر نشر ہوئی تو ان کے کچھ جاننے والے مجھے فون کر کے پوچھ رہے تھے کہ آیا یہ خبر درست ہے؟ کاش یہ خبر درست نہ ہوتی۔

مجھے ۱۴/مارچ ۲۰۰۶ء کا واقعہ یاد آگیا جب ایران سے ایک تذکرہ خلاصة الاشعار و زبدة الافکار (بخش کاشان) چھپ کر میرے پاس آیا۔ تذکرے کے بے خبر مرتّب نے ڈاکٹر شہریار نقوی اور ڈاکٹر علی رضا نقوی کی شخصیات کو گڈمڈ کر کے مقدمے میں یہ حاشیہ چڑھا دیا کہ ڈاکٹر نقوی مولفِ کتاب تذکرہ نویسی ''چند سال پہلے رحمت ایزدی سے جا ملے ہیں۔ خدا ان پر رحمت کرے''[۲]۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی ان دنوں اسلام آباد ہی میں مقیم تھے۔ میں نے فوراً فون اٹھایا۔ مجھے ان سے بے تکلفی سے بات کرنے کی جو اجازت اور رعایت حاصل تھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، از راہ تفنن کہا کہ استادِ محترم میرا آج کا فون آپ کی وفات پر آپ ہی سے تعزیت کے لیے ہے! وہ ہنسے اور صورت حال جان کر محظوظ ہوئے۔ ۱۲ دسمبر ۲۰۱۷ء کو بھی میں نے ان کی وفات کی خبر سن کر فوراً فون اٹھایا اور وہی نمبر ملایا، لیکن صدائے برنخاست۔ وہ آواز اب واقعی خاموش ہو چکی تھی۔

(۲)

۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء کو خانۂ فرہنگ ایران، ۳۴-بی سیٹلائٹ ٹاؤن، راول پنڈی میں فارسی سیکھنے کے لیے ہماری دوسری جماعت کا وہ پہلا دن تھا۔ ہم چند طلبہ و طالبات کمرے میں بیٹھے نئے استاد کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک انجانی شخصیت کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک غیبی قوت نے ہم سب حاضرین کو تعظیماً کھڑا کر دیا۔ وہ شخصیت اپنے لیے مخصوص

---

* سابق پروفیسر شعبہ فارسی، گورڈن کالج، راول پنڈی، مقیم ۶۹، ماڈل ٹاؤن، ہمک، اسلام آباد

کرسی پر تشریف فرما ہوئی اور ان کی زبان سے پہلا جملہ یہ ادا ہوا ''بہ کلاس دوّم خوش آمدید''۔ یہی ڈاکٹر سید علی رضا نقوی تھے۔ خوش شکل، خوش گفتار، خوش لباس، خوش قامت۔ انھوں نے تدریس کے حوالے سے ایک مختصر نصیحت آمیز تقریر کی جس کا ایک نکتہ یہ تھا کہ پہلی جماعت میں ہمیں جو چیزیں بتائی گئی ہیں، اگر دوسری جماعت میں وہ ان کو کسی دوسرے انداز میں بتائیں تو انھیں سابقہ استاد کے انداز پر آنے کے لیے نہ کہا جائے بلکہ جو چیز جیسے وہ بتائیں اسی کو درست جان کر استعمال کریں۔ یہ نکتہ ان کے خود پر اعتماد کی علامت تھا۔

ڈاکٹر صاحب سے تعلق کا جو سلسلہ ۱۹۷۱ء میں ان کی شاگردی اختیار کرنے سے شروع ہوا وہ ۱۹۸۴ء میں ان کے ساتھ کچھ عرصے (۱۹۸۹ء تک) کے لیے ہمکاری میں بدل گیا جب میں رسالہ دانش، اسلام آباد کا مدیر اور وہ اعزازی مشیر مقرر ہوئے اور اس دوران بھی ان سے سیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ ان سے نیازمندی کا یہ رشتہ ان کے آخری ایام تک برقرار رہا۔ یہ کوئی ۴۶ سال کا عرصہ بنتا ہے۔ اس عرصے میں نہ وہ مجھ سے اور نہ میں ان سے بے خبر رہا۔ آخری چند سالوں کو چھوڑ کر جب وہ کینیڈا اور بعد میں لاہور جا کر رہنے لگے، ہم ۱۹۷۱ء سے جڑواں شہروں راول پنڈی اسلام آباد میں رہ رہے تھے اور موقع مناسبت سے یہاں تہاں ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں نے ان کی ذاتی زندگی کو تو نہیں، البتہ علمی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان کی دو کتابوں کو چھوڑ کر، جو میرے علمی شعور سے پہلے پہلے تہران سے چھپ چکی تھیں، ان کا بقیہ سارا کام میرے سامنے ہی منصۂ شہود پر آیا اور میں ان کی تمام علمی سرگرمیوں کا عینی شاہد ہوں۔ خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی میں فارسی تدریس ہو یا مثنوی مولانا کا درس، رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران اسلام آباد اور مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اسلام آباد میں تقریبات ہوں یا فارسی/انگریزی ترجمہ کاری، ادارۂ تحقیقات اسلامی میں شعبۂ فقہ شیعہ کی ملازمت ہو یا سبک دوشی کی زندگی کے بعد قوانین فقہ شیعہ کے تراجم، ڈاکٹر صاحب کی مصروفیات کا مجھے علم رہتا تھا، بعض کا از خود اور بعض کا ان کی زبانی۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر فارسی زبان و ادب کے آدمی تھے۔ لیکن وہ بقول خود، ادارۂ تحقیقات اسلامی جا کر فقہ کے صحرائے اعظم میں گم ہو گئے۔ ایران سے پلٹنے کے بعد ان کی زندگی کا بڑا حصّہ فقہی قوانین پر مبنی کتب تصنیف یا ترجمہ کرتے گذر گیا اور آخری وقت تک وہ اسی موضوع کو نبھاتے رہے۔ فقہی اور قانونی موضوعات پر کام کرنے کے باوجود وہ ''زاہد خشک'' نہ تھے۔ فارسی ادب کی شیرینی نے ان کے مزاج میں فقہی خشکی کو داخل ہونے نہیں دیا تھا۔ ان کی خوش گفتاری میں اردو اور فارسی کے اشعار اور برمحل ضرب الامثال شامل رہتے تھے۔ آخری مہینوں میں جب وہ کچھ اونچا سننے لگے تو برسبیل مزاح کہتے تھے:

بہرا ہوں میں، تو چاہیے دُونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

ڈاکٹر صاحب کی طرف سے میرے لیے توشۂ زندگی دو بیش قیمت چیزیں ہیں۔ ایک انھوں نے میری فارسی تعلیم کی

پختہ بنیاد رکھی اور دوسرا عمر بھر وہ میرے خیر خواہ اور دعا گو رہے۔ مجھ پر انھیں جو معنوی حقوق حاصل ہیں، میں ان کی مادّی قیمت تو کبھی چکا نہیں سکا، اب ان کی وفات کے بعد خود پر ایک قرض واجب سمجھتے ہوئے یہ مضمون، ادائے دَین کے طور پر قلم بند کر رہا ہوں۔ اس کے ابتدائی حصّے میں ڈاکٹر صاحب کے وہ ذاتی اور علمی حالات شامل کیے ہیں جو مجھ تک پہنچے ہیں اور دوسرے حصّے میں ڈاکٹر صاحب سے وابستہ اپنی کچھ یادیں بیان کی ہیں۔

(۳) حالات

ڈاکٹر صاحب ۱۴ر مئی ۱۹۳۳ء کو امروہہ (ریاست اتر پردیش، بھارت) کے محلہ گذری میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید صفدر حسین نقوی کی پانچ اولادیں ہیں، تین بیٹے اور دو بیٹیاں۔ نرینہ اولاد میں ڈاکٹر صاحب منجھلے ہیں۔ ان کے بڑے بھائی سید خوشتر حسن نقوی (مرحوم) اور چھوٹے بھائی کا نام سید نقی رضا نقوی (مرحوم) تھے۔ اوپر آپ کا شجرۂ نسب مخدوم سید شرف الدین واسطی ملقب بہ شاہ ولایت (وفات: ۲۱ رجب ۷۸۳ھ-۱۳۸۱ء مدفون امروہہ) سے ملتا ہے۔ آپ دسویں امام، حضرت علی نقی کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے ''نقوی'' کہلاتے ہیں۔ امروہہ نقوی سادات کا قدیم مرکز ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خاندان کا ذریعہ معاش تھوڑی سی زرعی زمین تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے میٹرک کی تعلیم امام المدارس ہائی اسکول امروہہ میں حاصل کی۔ ۱۹۴۷ء میں انٹرمیڈیٹ کے لیے علی گڑھ چلے گئے اور وہاں داخلہ لیا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بننے پر ان کے خانوادے نے پاکستان ہجرت کرنے کو ترجیح دی اور ڈاکٹر صاحب اپنے خاندان کے ساتھ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو کراچی آ گئے۔ کراچی میں اسلامیہ کالج سے ۵۲-۱۹۵۱ء میں انٹرمیڈیٹ مکمل کیا۔ ۱۹۵۳ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بی اے (تاریخ اور سیاسیات مضامین کے ساتھ) پاس کیا۔ اس کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج [یونیورسٹی] لاہور میں ایم اے انگریزی میں داخلہ لیا لیکن خاندانی ذمہ داریوں کے باعث لاہور چھوڑ کر واپس کراچی چلے گئے اور اسے مکمل نہ کیا۔ کراچی میں ایس ام لا کالج سے ایل ایل بی مکمل کرنا چاہا لیکن امتحان میں نہ بیٹھے۔ آخر جامعہ کراچی میں ایم اے فارسی میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۵ء میں امتیازی حیثیت میں امتحان پاس کیا۔ ڈاکٹر غلام سرور (۱۹۰۹-۱۹۹۸ء) ان کے اساتذہ میں سے تھے۔ ڈاکٹر سرور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارغ التحصیل اور پروفیسر ہادی حسن (۱۸۹۶-۱۹۶۳ء) کے شاگرد تھے۔ ہادی حسن صاحب کا اپنے زمانے میں جدید ایرانی فارسی کے تلفظ اور فارسی تحقیق کے حوالے سے طوطی بولتا تھا۔ ڈاکٹر نقوی نے ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۶ء سہ سالہ بی اے (قانون) کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔ ۱۹۵۶ء میں وہ وظیفہ پا کر ایران چلے گئے اور تہران یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ تہران یونیورسٹی میں فارسی زبان و ادب میں ڈاکٹریٹ کے لیے ایرانیوں اور غیر ایرانیوں کے لیے الگ الگ نظام تعلیم ہے۔ ایرانیوں کے لیے پڑھائی سخت اور دورانیہ طویل ہے جب کہ غیر ایرانیوں کے لیے پڑھائی نرم اور دورانیہ کم تر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈاکٹریٹ میں داخلہ لیا اور ۱۹۶۳ء میں فارغ التحصیل ہوئے۔ تہران

یونیورسٹی میں اُس زمانے کے جن نامور اساتذہ سے انھوں نے کسب فیض کیا ان میں عبدالعظیم قریب، بدیع الزمان فروزانفر، جلال الدین ہمائی، مدرّس رضوی، ابراہیم پورداود، محمد مقدّم، پرویز ناتل خانلری، صادق کیا، احسان یارشاطر، محمد معین، منصور اختیار، آیت اللہ سنگلجی شامل ہیں۔ پاکستان واپس آکر ایک بار پھر ایران گئے اور ادارۂ تحقیقات اسلامی میں اپنی نئی ملازمت کے تقاضے کے پیش نظر ۱۹۶۶ء میں تہران یونیورسٹی کے دانشکدۂ حقوق (لا کالج) اور دانشکدۂ الٰہیات سے شیعہ فقہ اور قوانین کا ایک سالہ کورس کیا۔ تہران میں پی ایچ ڈی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ ایران کے انگریزی اخبارات ''تہران جرنل'' اور ''ایکو آف ایران'' میں بطور انگریزی مترجم کام کرتے رہے اور ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۴ء تک ایک انگریزی جریدے ''تہران اکونومسٹ'' کے ایڈیٹر رہے۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر صاحب پاکستان واپس آئے اور اسی سال ادارۂ تحقیقات اسلامی میں ان کا فارسی زبان اور شیعہ فقہ کے ماہر کے طور پر ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر تقرر ہوا۔ یہ ادارہ کراچی میں قائم تھا۔ جب دارالحکومت، اسلام آباد منتقل ہوا تو یہ ادارہ اسلام آباد منتقل ہو گیا اور ڈاکٹر صاحب بھی۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر صاحب اس ادارے سے بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر ہی سبک دوش ہوئے۔ اس ملازمت کے ساتھ ساتھ مختلف اداروں میں فارسی کی تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چناں چہ ابتدا میں ایک سال تک انسٹی ٹیوٹ [اب یونیورسٹی] آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۷۱ء میں خانۂ فرہنگ ایران، راول پنڈی میں نوآموزوں کو فارسی سکھانا شروع کیا اور یہ سلسلہ تقریباً ۲۷ سال تک جاری رہا۔ اسی دوران تین سال تک وہاں مثنوی مولانا روم کا درس بھی دیتے رہے۔ مثنوی فہمی میں وہ اپنے ایرانی استاد بدیع الزمان فروزانفر (۱۹۰۴-۱۹۷۰ء) کے مرہون منت تھے جن کا مولانا جلال الدین رومی اور **کلیات شمس** کی تدوین کے حوالے سے بڑا نام اور کام ہے۔

دوران ملازمت ڈاکٹر صاحب ادارۂ تحقیقات اسلامی کے جرائد فکر و نظر اور اسلامک اسٹڈیز (Islamic Studies) کی مجلس ادارت میں شامل رہے اور رایزنی فرہنگی سفارت ایران اسلام آباد کے سہ ماہی فارسی جریدے **دانش** کے اعزازی مشیر رہے۔

ڈاکٹر صاحب ایران میں اپنے پہلے طویل قیام کے بعد بھی مختلف کانفرنسوں میں شرکت کے لیے وہاں جاتے رہے۔ چناں چہ ۱۹۸۴ء، ۱۹۹۳ء، ۱۹۹۴ اور ۲۰۱۲ء میں وہاں تشریف لے گئے۔ ۱۹۹۳ء کا سفر شیخ مفید کانفرنس میں شرکت کے لیے تھا۔ ۲۰۱۲ء کا سفر اپنی کتاب فرہنگ جامع پر ایوارڈ وصول کرنے کے لیے تھا۔ مختصر سفر پر دو بار عراق اور ایک بار کویت گئے۔ ڈاکٹر صاحب سال ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۵ء وقفوں وقفوں سے اپنے بیٹیوں کے پاس کینیڈا میں بھی مقیم رہے۔ انھوں نے زندگی اسلام آباد میں گذاری لیکن آخری آرام گاہ لاہور میں قرار پائی۔

(۴) تصانیف و تراجم

اس سے پہلے کہ ڈاکٹر صاحب کی فارسی علمی وراثت پر گفتگو کی جائے، بہتر معلوم ہوتا ہے ان کے فارسی سیکھنے کے شوق کا ذکر کیا جائے۔ اگر چہ وہ بچپن ہی سے فارسی زبان سیکھنے کی طرف مائل تھے لیکن ان کے اس شوق کو مہمیز اس وقت ملی جب ۱۹۴۹ء میں سوویٹ یونین سے ایک علمی وفد پاکستان آیا، جس میں تاجکستان کے معروف شاعر میرزا تورسون زادہ (۱۹۱۱۔۱۹۷۷ء) بھی شامل تھے اور انھوں نے کئی تقاریب میں فارسی کے تاجکی لہجے میں تقریریں کیں۔ ڈاکٹر صاحب، جو اس وقت سولہ سال کے نوجوان تھے، تقاریر سنتے رہے۔ انھیں محسوس ہوا کہ وہ ان تقریروں کو اچھی طرح سمجھ پائے ہیں لیکن اس زبان (فارسی) کو مزید سیکھنا چاہیے۔ چناں چہ انھوں نے "منشی فاضل" کا امتحان دیا جو ہندو پاکستان میں فارسی زبان و ادب سے مخصوص ہے۔ ۱۹۵۵ء میں جب وہ جامعہ کراچی سے ایم اے فارسی کے امتحان میں اوّل آئے تو انھیں فارسی کے میدان میں آگے بڑھنے کی لگن لگی۔ اس زمانے میں ایرانی سفارت خانہ کراچی میں تھا۔ سفارت خانے کے ثقافتی قونصلر ڈاکٹر روستائیان نے ڈاکٹر صاحب کو اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومت ایران کی طرف سے وظیفے کی پیش کش کی جسے ڈاکٹر صاحب نے قبول کر لیا اور وہ ایران چلے گئے اور تہران یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ وہاں ان کی ملاقات اپنے ہم وطن ڈاکٹر شہر یار نقوی[۳] سے ہوئی جو تہران یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ان سے پہلے ڈاکٹریٹ مکمل کر چکے تھے۔ ان کی ہدایات کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی آیندہ تحقیق کا رخ متعین کیا۔ شہر یار نقوی نے ڈاکٹر صاحب کے سامنے حافظ محمود خان شیرانی (۱۸۸۰۔۱۹۴۶ء) کا یہ نظریہ دُہرایا کہ برّعظیم کے لوگوں نے فارسی زبان میں فرہنگ نویسی اور تذکرہ و تاریخ نگاری میں جو خدمات انجام دی ہیں، ایرانیوں کو ان سے کماحقہٗ متعارف نہیں کیا گیا، ایران جانے والے طلبہ کو چاہیے کہ وہ مقدور بھر اس ذمہ داری کو پورا کریں۔ محمود شیرانی کی خواہش کی تکمیل میں، شہر یار نقوی پہلے ہی فرہنگ نویسی فارسی در ہند و پاکستان لکھ چکے تھے جو ۱۹۶۲ء میں تہران سے شائع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے تذکرہ نویسی پر تحقیق کو اپنے لیے چنا[۴]۔

ڈاکٹر صاحب نے تصنیف، تحقیق اور ترجمے کا کام ایران میں دوران تعلیم ہی شروع کر دیا تھا۔ ان کا پہلا کام اردو کے ۱۵ جدید شعرا کے کلام کے فارسی ترجمے اور مختصر حالات زندگی پر مشتمل ایک کتاب چہ ہیمالیا (**برگزیدۂ شعر پانزدہ تن از شاعران اردو زبان**) تھا جو انھوں نے اپنے ایک اصفہانی دوست ڈاکٹر جلیل دوست خواہ کی مدد سے تیار کیا اور ۱۹۶۳ء میں کتابخانۂ طہوری، تہران سے شائع ہوا۔ اس میں حسب ذیل شعرا کو شامل کیا گیا ہے: الطاف حسین حالی، محمد اقبال، جوش ملیح آبادی، ن م راشد، اسرار الحق مجاز، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، جان نثار اختر، احمد ندیم قاسمی، فارغ بخاری، جگن ناتھ آزاد، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، ادا جعفری، خاطر غزنوی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر صاحب اوائل عمری میں خود بھی اردو شعر کہتے رہتے ہیں اور ان کا یہ کلام ان کی ڈائریوں میں محفوظ ہے۔ کچھ نمونۂ کلام ان کے تعزیتی

جلسے (منعقدہ ۲۶ر دسمبر ۲۰۱۷ء ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد) میں سننے کا اتفاق ہوا۔

جس کام نے ڈاکٹر صاحب کو علمی شہرت دی وہ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تذکرہ نویسی فارسی در ہندو پاکستان (ہندو پاکستان میں فارسی تذکرہ نگاری) ہے جو ان کے فارغ التحصیل ہوتے ہی اگلے سال ۱۹۶۴ء میں تہران کے ناشر موسسۂ مطبوعاتی علمی نے شائع کیا۔ یہ اشاعت ۸۷۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ برّ عظیم میں فارسی شعرا کی تذکرہ نگاری کی روایت کی تاریخ قلم بند کرنے کی پہلی علمی کوشش ہے۔ اس میں تاریخی طور پر برّ عظیم کے علاقوں میں تقریباً ۶۱۸ھ/۱۲۲۱ء میں تصنیف ہونے والے پہلے فارسی تذکرے لباب الالباب سے لے کر ۱۳۸۲ھ/ ۱۹۶۲ء میں لکھے جانے والے **تذکرۂ شعرائے یزد** تک فارسی تذکروں کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں ایک اور تذکرے برگزیدہ از پارسی سرایان کشمیر کا تعارف بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کتاب میں کل ۹۳ تذکروں کا تذکرہ ہوا ہے۔ کتاب کے آخر میں ۹ ضمیمے لگا کر مزید کئی تذکروں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے ان تذکروں پر کام کیا تھا، بہت کم تذکرے شائع ہوئے تھے۔ چناں چہ انھوں نے پاکستانی اور ایرانی کتب خانوں میں ان تذکروں کے مخطوطات دیکھ کر اور ہندوستان سے مخطوطات کی تفصیل منگوا کر اپنا کام راست ماخذ دیکھ کر مکمل کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا اس کتاب میں طریقۂ کار یہ رہا کہ ہر زیر بحث تذکرے کی ابتدائی سطور، مصنف کے حالات، کتاب پر تبصرہ، قلمی نسخوں کی تفصیل اور فہرست شعرا (یا اس کے لیے کوئی دوسرا حوالہ) درج کرتے ہیں [۵]۔

ایران میں پہلوی دور سے ہر سال شائع ہونے والی مختلف موضوعات پر بہترین کتابوں کا چناو ہوتا ہے اور حکومت ایران کی طرف سے توصیفی سند کے ساتھ خطیر رقم انعام میں دی جاتی ہے۔ چناں چہ جب ڈاکٹر صاحب کی کتاب تذکرہ نویسی ایران میں شائع ہوئی تو اسے ۱۳۴۳ شمسی (۱۹۶۴ء) سال میں ''جایزۂ شہنشاہی'' (شاہی انعام) کے لیے فارسی ادب میں بہترین کتاب قرار دیا گیا اور نوروز (مارچ) ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے شاہ ایران محمد رضا پہلوی (عہد سلطنت: ۱۹۴۱-۱۹۷۹ء) کے ہاتھوں انعام اور شاہ کے دستخط کے ساتھ توصیفی سند حاصل کی۔ یہ ایران میں پاک و ہند کے کسی بھی فارسی محقق کو اس کی کتابی تحقیق پر ملنے والا پہلا انعام تھا [۶]۔

ڈاکٹر صاحب ایران میں قیام کے دوران فارسی کے جدید لہجے اور جدید اصطلاحات سے آشنا ہوئے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ، ذاتی دوستوں، رفقاے کار، شرارتی بچوں اور باتونی بڑھیاوں سے فارسی کی نئی نئی اصطلاحات سنیں۔ اسی دوران انھیں جدید فارسی الفاظ و محاورات کی فرہنگ تدوین کرنے کا خیال گذرا۔ پاکستان واپس پہنچ کر انھوں نے اس فرہنگ پر کام شروع کر دیا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی دیگر دفتری مصروفیات کے باعث اس کی تکمیل میں وقت لگا اور یہ فرہنگ جامع فارسی بہ انگلیسی و اردو *Standard Dicionary Persian into English & Urdu* نام سے پہلی بار ۱۹۹۴ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد اور نیشنل بک فاونڈیشن، اسلام آباد کے اشتراک سے شایع ہوئی۔

اس ایڈیشن میں اسّی ہزار الفاظ شامل ہیں۔اس اشاعت کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب نے اس فرہنگ پر مزید کام جاری رکھا اور کئی اصلاحات اور اضافات کے بعد اس کی نظر ثانی شدہ اشاعت ۲۰۰۳ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد کی طرف سے عمل میں آئی لیکن ڈاکٹر صاحب اس اشاعت سے مطمئن نہ تھے کیوں کہ طباعت کے دوران چھاپہ خانے نے عجلت میں کئی الفاظ کی تختیاں گم کر دیں اور وہ چھپنے سے رہ گئیں (مثال: صفحہ ۵۸۱ لفظ ''سمپوزیوم'' اور ''سیاست کردن'' کے درمیانی الفاظ)۔نیز کاغذ اور طباعت بھی غیر معیاری تھی۔چناں چہ ڈاکٹر صاحب اس کا تیسرا ایڈیشن مزید اصلاحات، تکمیل اور اضافات کے ساتھ ۲۰۱۱ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد کی طرف سے لائے اور اب یہی اس کا مستند ایڈیشن ہے۔اس فرہنگ کی خصوصیات حسب ذیل ہیں: فارسی لفظ کا اندراج، ایک اختصاری حرف کے ذریعے قواعد زبان کے لحاظ سے اس لفظ کی حیثیت کا تعیّن، رومن تلفظ، اردو اور انگریزی معنی، انگریزی لفظ کا بذریعہ اختصار اس کی حیثیت کا تعیّن۔بعض فارسی الفاظ کے ساتھ ستارے کی علامت لگائی گئی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ یہ لفظ اردو میں بھی اسی طرح رائج ہے۔پاکستان میں موضوع کے اعتبار سے یعنی جدید فارسی الفاظ اور محاورات کے لیے مرتّب ہونے والی یہ دوسری فرہنگ ہے۔پہلی ایف ڈی رازی کی فرہنگ نامۂ جدید فارسی - اردو - انگلیسی (لاہور ۱۹۵۲ء طبع اول) تھی جس میں بیس ہزار الفاظ ہیں۔لیکن فرہنگ جامع کے تیسرے ایڈیشن میں تقریباً ایک لاکھ الفاظ ہیں اور اس کی جہات بہت وسیع ہیں۔فرہنگ جامع کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اردو ضمیمہ ''فارسی املاء تلفظ قواعد (گرامر) کے بعض بنیادی اصول'' بھی شامل ہے۔

اس فرہنگ کے تیسرے ایڈیشن کو ایران میں ''انتیسویں کتابِ سال'' کمیٹی نے سال ۲۰۱۱ء میں ایران سے باہر شائع ہونے والی فارسی زبان سے متعلق بہترین کتاب قرار دیا اور مصنف کو فروری ۲۰۱۲ میں ایران بلوا کر ایرانی صدر محمود احمدی نژاد (عہد صدارت: ۲۰۰۵ - ۲۰۱۳ء) کے ہاتھوں انعام دیا گیا۔

میرا ذاتی خیال ہے کہ حروف نگاری اور صفحہ آرائی کے نقطۂ نظر سے فرہنگ جامع کے تینوں ایڈیشنوں میں کمزوریاں ہیں اور کوئی ایڈیشن بھی عالمی معیار طباعت کا نہیں ہے اور نہ ہی اُس محنت کو نمایاں کرتا ہے جو مصنف نے اس فرہنگ کی تیاری میں کی ہے۔بہتر ہوتا یہ فرہنگ، اوکسفورڈ جیسے اشاعتی ادارے سے شائع ہوتی جو فرہنگیں چھاپنے کا وسیع تجربہ رکھتا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا ڈاکٹر صاحب نے راول پنڈی کے ایرانی ثقافتی مرکز میں ۲۷ سال تک پاکستانیوں کو فارسی سکھائی۔پہلے ایرانی ثقافتی مراکز میں ایرانی وزارت تعلیم کی تیار کردہ وہی درسی کتب پڑھائی جاتی تھیں جو ایرانی مدارس میں بھی رائج ہیں۔ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفیق کار ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی (۱۹۲۷ - ۱۹۹۷ء) مصنف فارسی گویان پاکستان نے جب ایرانی نصاب کو پاکستانی فارسی آموزوں کے لیے ناموزوں پایا تو خود درسی کتاب تیار کرنے کی

ٹھانی۔ چناں چہ ۱۹۸۸ء میں ان دونوں کی مشترکہ کوشش سے گلشن فارسی تخلیق ہوئی جو سرورق کی تصریح کے مطابق کتاب درسی فارسی امروز برای غیر فارسی زبانان (غیر فارسی زبانوں کے لیے جدید فارسی کی درسی کتاب) ہے اور یہ پاکستان میں قائم تمام ایرانی ثقافتی مراکز میں تدریس کے لیے تھی۔ اس کتاب کی تین جلدیں تین مختلف درجوں کے لیے تیار ہوئیں اور خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی اور رایزنی فرہنگی سفارت ایران اسلام آباد کی طرف سے چند بار شائع ہو چکی ہیں ۷۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے لیے انھوں نے ڈاکٹر سبط حسن رضوی، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی اور ڈاکٹر محمد ریاض (۱۹۳۵ - ۱۹۹۴ء) کے ساتھ مل کر ایک فارسی نصاب فارسی انٹرمیڈیٹ یونٹ ۱-۱۸ کوڈ ۳۶۱ مرتب کیا۔ یہ کتاب ۱۹۹۳ء میں شائع ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مذہبی پس منظر، ادارۂ تحقیقات اسلامی سے وابستگی، ادارے کے تقاضوں اور تہران کے دانشکدۂ حقوق اور دانشکدۂ الٰہیات سے حاصل کردہ تخصص کی بنا پر بہت سا کام ملکی قوانین اور شیعہ فقہ اور عائلی قوانین پر تحقیق و تراجم کے ذریعے کیا۔ اس سلسلے میں ان کا پہلا کام انگریزی کتاب *Judicial System of Pakistan* کا فارسی ترجمہ دستگاہ قضائی پاکستان تھا جو وزارت قانون حکومت پاکستان نے ۱۹۷۰ء میں شائع کیا۔ اگلے سال ۱۹۷۱ء میں ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد سے ان کی دوسری کتاب *Family Laws of Iran* انگریزی میں شائع ہوئی۔ ۱۹۷۸ء میں ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا، وہاں اسلامی قوانین پنپنے لگے اور قانونی طور پر فقہ شیعہ کا اطلاق ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب کی توجہ وہاں کے قوانین کی طرف منعطف ہوئی۔ سب سے پہلے انھوں نے اسلامی جمہوریہ ایران کی مجلس شورائے اسلامی کی قانون ساز کمیٹی کا ۱۲ جولائی ۱۹۸۲ء کو منظور کردہ مجموعۂ قوانین جزائی اسلامی ایران کا انگریزی ترجمہ *Islamic Penal Code of Iran* کیا جسے مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا۔ اردو میں انھوں نے حدود و قصاص و دیات شیعہ لکھی جو ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۸۵ء سے شائع ہوئی۔ روح اللہ خمینی (۱۹۰۲ - ۱۹۸۹ء) کے فتووں اور فقہی آرا پر مشتمل کتاب تحریر الوسیلہ کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ *Tahrir Al-vasilah* کیا۔ یہ ترجمہ، مؤسسہ تنظیم و نشر آثار امام خمینی، تہران سے چھپ چکا ہے۔ جلد اول ۲۰۰۱ء، جلد دوم ۲۰۰۲ء، جلد سوم ۲۰۰۷ء، جلد چہارم ۲۰۱۱ء۔

ڈاکٹر صاحب نے شیعہ فقہی احکام اور قوانین پر چار کتابیں انگریزی زبان میں بہت محنت سے تیار کیں جو پاکستان اور ایران سے طبع ہو چکی ہیں۔ ان کی تفصیل یہ ہے:

Shia Divorce Law (شیعہ قانون طلاق)، ۲۰۱۲ء (پہلا ایڈیشن مجمع العالمی اہل البیت)، ۲۰۱۶ (تیسرا ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ و نشر المصطفیٰ، قم)

Shia Inheritance Law (شیعہ قانون وراثت)، ۲۰۱۲ء (پہلا ایڈیشن مجمع العالمی اہل البیت)، ۲۰۱۶ء (دوسرا ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ، قم)

Shia Marriage Law (شیعہ قانون نکاح)، ۲۰۱۵ء، ۲۰۱۶ء (دوسرا اور تیسرا نظر ثانی شدہ ایڈیشن مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ، قم)

Shia Wills Law (شیعہ قانون وصایا)، ۲۰۱۷ء (مرکز بین المللی ترجمہ ونشر المصطفیٰ، قم)

ڈاکٹر صاحب نے عراقی عالم دین اور شیعہ مرجع محمد باقر الصدر (۱۹۳۵-۱۹۸۰ء) کی اسلامی معیشت پر معروف کتاب اقتصادنا کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جو پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس (P.I.D.E) قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد سے شائع ہونا قرار پایا تھا لیکن اس کی اشاعت کی تصدیق نہیں ہوسکی۔

انھوں نے اسلامی جمہوریہ ایران و پاکستان کی سرکاری ثقافتی پالیسی (علی الترتیب منظور شدہ ۱۱ اگست ۱۹۹۲ء، ۱۹ فروری ۱۹۹۵ء) کا انگریزی ترجمہ *Principles of the Cultural Policy of the Islamic Repbubic of Iran & the Islmic Republic of Pakistan* کیا جو ۱۹۹۶ء میں مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد نے شائع کیا۔

تراجم کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب کی چند اور کتب بھی ہیں۔

اسلامی پردے کے موضوع پر زہرا رہنورد کی فارسی کتاب زیبائی حجاب و حجاب زیبائی کا انگریزی ترجمہ *Beauty of Concealment and Concealment of Beauty* کیا۔ اسے رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد، نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ کتاب کی مصنفہ، سابق ایرانی صدر میر حسین موسوی کی اہلیہ ہیں۔

جواد منصوری کی فارسی کتاب فرہنگ استقلال کا اردو ترجمہ انھوں نے ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی کے ساتھ مل کر کیا جو رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اسلام آباد نے ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ جواد منصوری ۱۹۸۹ تا ۱۹۹۳ء پاکستان میں ایرانی سفیر رہے تھے۔

ابو ریحان بیرونی کی معروف عربی کتاب آثار الباقیہ کا اردو ترجمہ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے ۲۰۰۲ء میں شائع کیا۔

مقالات

ڈاکٹر صاحب کے اردو، فارسی اور انگریزی میں کئی مقالات ایرانی اور پاکستانی جرائد میں چھپتے رہے ہیں جن کی فہرست تیار ہونا باقی ہے۔ بعض مجلّاتی اشاریوں میں ڈاکٹر صاحب کے مطبوعہ مقالات کا اندراج ہوا ہے۔ یہاں ان اشاریوں کا ذکر کر کے چیدہ چیدہ مقالات کا ذکر کیا جاتا ہے:

اشاریوں میں مقالات کا اندراج:

ایرج افشار، فہرست مقالات فارسی، تہران، ۱۹۹۵ء، جلد ۵، ص ۷۰۸ (۸ مقالات)؛ تہران، ۲۰۰۴ء، جلد ۶، ص ۳۳۷ (مرتّب فہرست نے علی رضا اور شہریار نقوی کو خلط ملط کر کے دونوں کے مقالات کا یکجا ذکر کیا ہے، اس میں اندراج ۲۹۷۲ شہریار سے متعلق اور باقی ۱۳ اندراجات علی رضا سے متعلق ہیں)

ایران ناز کاشیان، فہرست مقالات فارسی در زمینۂ تحقیقات ایرانی، تہران، ۲۰۰۹ء، ج ۷، ص ۱۲۶۰ (۱ اندراج)؛ تہران، ۲۰۱۳ء، ج ۹، ص ۶۱۱ (۱ اندراج)

شیر نوروز خان، اشاریہ فکر و نظر جولائی ۱۹۷۸ -جون ۱۹۹۳ء، ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء، ص ۴۶ (۴ اندراجات)

محمد شاہد حنیف، پیغام آشنا ۱۰ سالہ اشاریہ/پیغام آشنا کے دس سال [فروری ۲۰۰۰ تا ۲۰۱۰ء] ضمیمۂ پیغام آشنا، شمارہ ۴۰، اسلام آباد۔ ۲۰۱۰ء، ص ۹۰ (۱ اندراج بسلسلہ فرہنگ جامع)

مرتضی موسوی و شگفتہ یسین عباسی، فہرست موضوعی مقالات علمی فصل نامہ ی دانش در سی سال (از ۱۳۶۴ تا ۱۳۹۳ خورشیدی-۱۹۸۵ تا ۲۰۱۵ میلادی) از شمارہ ی ۱ تا شمارہ ی ۱۱۹، دانش، اسلام آباد، شمارہ ۱۲۱، تابستان ۲۰۱۵/۱۳۹۴ء، ص ۲۱۹-۲۲۰ (۱۲ اندراجات)

چیدہ چیدہ مقالات

۱۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے زیر اہتمام تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند (لاہور، ۱۹۷۱ء)، کی تیسری، چوتھی اور پانچویں جلدیں فارسی ادب سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے چوتھی جلد کے نویں باب میں مضمون ''شعرا کے تذکرے ۱۵۲۶-۱۷۰۷ء'' (ص ۵۷۰-۶۱۹) اور پانچویں جلد کے چوتھے باب میں مضمون ''شعرا کے تذکرے ۱۸۵۷-۱۹۷۰ء'' (ص ۵۴۱-۵۵۴) قلم بند کیا۔

۲۔ جب دانش کا شمارہ ۵-۷ (۱۹۸۷ء) ڈاکٹر غلام سرور کے حین حیات ان کے لیے مخصوص کیا گیا تو ڈاکٹر نقوی نے اپنے اس استاد کا حق ادا کرنے کے لیے مضمون ''سیری در آثار استاد سرور'' (ص ۳۹-۵۷) لکھا۔ اس کے ابتدائیہ میں والہانہ طور پر یہ جملہ لکھا: ''میرے لیے یہ امر بے حد فخر و مباہات کا موجب ہے کہ میں استاد بزرگوار (غلام سرور) کے علم و فن کے باغ کا خوشہ چین ہوں اور مجھ بے مایہ پودے کی جڑ بھی دانش و ہنر کے اسی پُر گل و ثمر باغ سے جُڑی ہوئی ہے۔'' (ترجمانی)

۳۔ جب دانش نے افغانستان کے معروف شاعر استاد خلیل اللہ خلیلی (۱۹۰۷-۱۹۸۷ء) کی یاد میں خصوصی شمارہ ۱۲ (۱۹۸۷ء) نکالا تو ڈاکٹر صاحب نے خلیلی کی تمام دستیاب تصانیف کو سامنے رکھ کر ایک تعارفی مقالہ ''مختصری از شرح حال و

آثار استاد خلیلی'' سپرد قلم کیا (ص ۹-۶۷)۔ استاد خلیلی کی تصانیف کے تعارف کے لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ فارسی مقالہ اس قدر مفید اور معلوماتی ہے کہ جداگانہ شائع ہونے کے لائق ہے۔

۴۔ انھوں نے پاکستانی شاعر عطا اللہ خان عطا (وفات: ۲۵ مارچ ۱۹۹۱ء ڈیرہ اسماعیل خان) کے فارسی مجموعۂ کلام بزم سخن (نشر: خانۂ فرہنگ ایران، پشاور، ۱۹۹۵ء) پر مختصر مقدمہ بھی لکھا۔

۵۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے جب مختلف زبانوں میں پاکستانی ادب کے تراجم کا اہتمام کیا تو معاصر اردو شاعری اور افسانوں کے تراجم پر مشتمل ایک مجموعہ ادبیات پاکستان نام سے اسلام آباد، ۱۹۹۵ء سے شائع ہوا۔ مترجمین میں ڈاکٹر علی رضا نقوی بھی شامل تھے۔

(۵) یادیں

مضمون کے اس حصّے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ڈاکٹر علی رضا نقوی مرحوم سے متعلق اپنی یادوں کا کچھ حصّہ قلم بند کروں جس سے ان کے اخلاق جلیلہ اور نیک کردار پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

۱۹۷۱ء میں جب ڈاکٹر صاحب کی شاگردی میں آیا تو میری عمر سولہ سال تھی۔ جماعت میں عمر اور قدوقامت کے لحاظ سے میں سب سے چھوٹا ''بچّہ'' تھا۔ جماعت میں داخلے کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی اور فارسی کے شوق میں ہماری جماعت میں چالیس پچاس سالہ افراد بھی موجود تھے۔ میں نے کوشش کی کہ اپنی خردی کے باوجود استاد محترم پر ذمہ دار اور محنتی طالب علم ہونا ثابت کروں۔ اس کے لیے ایک طالب علمانہ کوشش یہ کی کہ جو کچھ ڈاکٹر صاحب جماعت میں پڑھاتے تھے میں اسے الگ دفتر (کاپی) میں ایک خاص نظم وضبط کے ساتھ، عمدہ لکھائی میں لکھتا جاتا تھا۔ ۲۳ ستمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۹ جنوری ۱۹۷۲ء تک انھوں نے ہمیں کل ۲۳ درس دیے۔ یہ سب کے سب میں نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک خاص ترتیب سے اس دفتر میں نقل کر لیے۔ ہر درس کی یادداشتوں میں ایک عنوان ''فرمودۂ آموزگار'' ہوتا جس میں ڈاکٹر صاحب کی نصاب سے ہٹ کر بتائی ہوئی کوئی ایک خاص بات یا نصیحت قلم بند کر لیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے واقعات بھی بتاتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ بتایا کہ جب وہ علی گڑھ میں پڑھتے تھے تو ان کے ایک استاد کا نام ''مسعود'' تھا۔ وہ جلدی جلدی پڑھا کر فارغ ہوجاتے اور چلے جاتے۔ اس عادت کی بنا پر سب لڑکے انھیں ''مسعود گھوڑا'' کہتے تھے، مگر جب ڈاکٹر صاحب نے پڑھنے میں دلچسپی ظاہر کی تو اس کے بعد مسعود صاحب ہمیشہ دل جمعی سے پڑھانے لگے۔

ہماری فارسی کی جماعت دوم جاری تھی کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ شروع ہوگئی۔ سقوط مشرقی پاکستان کا المیہ بھی ہوگیا۔ جنگ کے دوران تدریس ایک ماہ کے لیے روک دی گئی۔ ۶ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب دوبارہ تدریس شروع ہوئی تو اس روز ڈاکٹر صاحب نے تمام حاضر طلبہ وطالبات سے خیریت دریافت کی اور استحکام پاکستان کی دعا کی۔ اگرچہ گذشتہ جنگ کے نتائج کی وجہ سے وہ کچھ پریشان دکھائی دیتے تھے لیکن ان کا جذبہ اور حوصلہ بلند تھا اور مستقبل کے مسائل

سے نمٹنے کے لیے دل میں بے پناہ جوش اور عزم کارفرما تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یہ جنگ صرف سرحدوں پر ہی نہ لڑی گئی بلکہ تمام قوم ہر جگہ اور ہر محاذ پر ملک و ملّت کے تحفظ کے لیے مصروف کار تھی۔

۱۹ر جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہماری آخری کلاس تھی۔ اس روز انھوں نے دردمندی سے کچھ باتیں کیں جو میں نے قلم بند کرلیں۔ یاد رہے کہ یہ ۱۹۷۲ء کی من وعن تحریر ہے اور لکھنے کا چنداں سلیقہ نہ تھا۔ استادِ محترم نے فرمایا:

> فارسی کی یہ جماعت منعقد کرنے سے میرا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ علم و ادب سے والہانہ لگن مجھے یہاں تک کھینچ لاتی ہے۔ اگر میں پیسے کمانا چاہتا تو میں ریڈیو یا ٹیلی ویژن میں بھی فارسی جماعت منعقد کرواسکتا ہوں۔ خانۂ فرہنگ ایران راول پنڈی والے مجھے خریدنا چاہتے ہیں مگر میری قیمت ادا نہیں کرسکتے۔ میری قیمت تو شاہ ایران بھی ادا نہیں کرسکے اور نہ ہی وہ مجھے خرید سکے۔ وہ مجھے اپنا مشیر رکھنا چاہتے تھے، مگر میرے دل میں اپنے وطن اور ملّت کی محبت موجزن تھی اور میں اپنی قوم کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنے وطن واپس لوٹ آیا۔ اِس ملک میں بڑے بڑے درخشندہ و تابندہ ہیرے پڑے ہوئے ہیں مگر ناقدری کا شکار ہیں۔ میرے پاس علم کا جو خزانہ ہے، اُسی قدر و قیمت کے ایک خزینے کے مالک جناب وزیرالحسن عابدی صاحب ہیں اور میں ان کی خاکِ پا ہوں [۸]۔

میں نے جب ڈاکٹر صاحب کو ان کے دروس پر مشتمل اپنی تیار اور تحریر کردہ کاپی دکھائی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب بار بار جماعت میں ہم شاگردوں کو حاضر رہنے اور دل چسپی سے فارسی سیکھنے کی نصیحت کرتے رہتے تھے۔ اس طالب علمانہ کاوش سے میں تھوڑا بہت یہ تاثر قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ میں نے فارسی سیکھنے میں دل چسپی لی ہے۔

۱۹۷۱ء سے ڈاکٹر صاحب ایک فرہنگ کی تیاری میں مصروف تھے۔ ہر لفظ کے لیے وہ ایک پرچی یا کارڈ بنا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان کارڈوں کو تہجی ترتیب میں لگانے کے لیے اپنے پسندیدہ شاگردوں سے مدد لیتے تھے۔ اُس زمانے میں مجھے بھی یہ خدمت کرنے کا موقع ملا اور ڈاکٹر صاحب کے گھر جاکر ان کارڈوں کو ترتیب دیتا رہا۔ اس فرہنگ کی تیاری طول کھینچ گئی۔ ۱۹۹۰ء کے بعد کہیں جاکر اس کی کتابت شروع ہوئی اور پروف تیار ہوئے۔ ۱۹۹۲ء میں جب میں تہران میں تھا تو ڈاکٹر صاحب ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے تہران تشریف لائے۔ فرہنگ کے پروف ان کے پاس تھے۔ وہ پروف میرے حوالے کرگئے اور میں نے اس کے ابتدائی پانچ سو صفحات کے پروف پڑھے۔ ۱۹۹۴ء میں یہ فرہنگ جامع کے نام سے شایع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے فرہنگ کے دیباچے میں بغیر نام لیے اپنے ''شاگردوں'' کی معاونت کا شکریہ ادا کیا ہے۔

جب ۱۹۸۴ء میں رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری ایران، اسلام آباد سے فارسی سہ ماہی دانش کا اجرا ہوا تو ڈاکٹر صاحب کو اعزازی مشیر اور مجھے اس کا مدیر مقرر کیا گیا۔ اشاعت سے پہلے مقالات ایک نظر ڈاکٹر صاحب بھی دیکھتے اور ان

پر کبھی کبھی قلم لگا دیتے تھے جسے میں غور سے دیکھتا کہ ڈاکٹر صاحب نے کس لفظ کو بدلا ہے۔ مرکز تحقیقات فارسی یا رایزنی فرہنگی ایران میں کسی علمی تحریر یا دیباچے کو اردو یا انگریزی سے فارسی میں منتقل کرنا ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کی خدمات لی جاتیں کیوں کہ ان کی فارسی تحریر نہ صرف پختہ، سالم اور فصیح تھی بلکہ ایرانی محاورے کے مطابق ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب بولتے بھی ایرانی لہجے میں تھے۔ بلکہ لہجے سے آگے کی ایک چیز، آواز کا اتار چڑھاو اور ایرانی ادا بھی ہے، یہ سب چیزیں ڈاکٹر صاحب کی مکالماتی فارسی میں موجود تھیں[۹]۔

ڈاکٹر صاحب ہم طالب علموں کو اپنی دو باتیں فخر سے بتایا کرتے اور ان کا فخر بجا تھا۔ پہلی یہ کہ، تہران یونیورسٹی کی تاریخ میں اب تک صرف دو غیر ایرانی ایسے طالب علم ہیں جنھوں نے ''دتا'' یعنی ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈاکٹریٹ لی ہے، ایک وہ اور دوسرے کلکتہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر عطا کریم برق (۱۹۲۲-۱۹۹۹ء)۔ دوسری بات یہ کہ، برّصغیر کے وہ پہلے فارسی نویس مصنف ہیں جن کی کتاب تذکرہ نویسی کو ایران میں سال کی بہترین کتاب کا ایوارڈ ملا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے محضر میں مجھ جیسے نوعمر فارسی آموز کو یہ باتیں مہمیز دینے والی تھیں۔ میں نے ۱۹۷۱ء میں ہی اپنے لیے فارسی کا راستہ چُن لیا تھا۔ جب علمی زندگی میں فارسی کے حوالے سے اپنے لیے ترقی کی کوئی منزل طے کرنے کا وقت آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی ذات کو اپنا تخیل اور محور بنایا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی کامیابیوں کو مدّنظر رکھ کر انھی دو خواہشات کو اپنا علمی مقصد بنایا۔ ایک تہران یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ڈاکٹریٹ کی وہی ڈگری حاصل کرنا جو انھوں نے لی تھی اور دوسرا فارسی کے حوالے سے ایسی تحقیق کرنا جسے ایرانی بھی تسلیم کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی دعاوں سے یہ دونوں خواہشات اللہ تعالیٰ نے پوری کر دیں۔ اگرچہ تہران یونیورسٹی سے ایرانیوں کے لیے مخصوص ڈگری لینے کی میری آرزو اُس طرح پوری نہ ہو سکی لیکن غیر ملکیوں کو ڈاکٹریٹ کی جو ڈگری دی جاتی ہے وہ وہاں سے لے لی۔ دوسری خواہش بدرجۂ اتم پوری ہوئی اور ایران میں ۲۰۰۲ سے لے کر ۲۰۱۴ء تک میری پانچ کتابوں اور ایک مقالے کو ''بہترین'' کا ایوارڈ ملا۔ ۲۰۱۲ء میں جب میری تالیف کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شدہ در شبہ قارہ، تہران سے شائع ہوئی اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو دکھائی تو وہ جبھی دعا گوئی کے لہجے میں اس کی پسندیدگی کا اظہار فرما چکے تھے۔ جب ۱۱ فروری ۲۰۱۴ء کو اس کتاب کو ایران میں ''بین الاقوامی کتاب سال'' ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا تو ڈاکٹر صاحب کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں اس واقعہ کی تصویری خبر دی تو ۱۷ فروری کو ان کا تہنیت و تبریک سے لبریز ای میل بہ زبان انگریزی ملا۔ جی چاہتا ہے ان کے اپنے الفاظ یہاں بھی محفوظ کر دوں جو میرے لیے یادگار ہیں:

Best and heartiest congratulations on your great achievement, on behalf of myself and all members of my family to you and all members of your family. Thanks Allah, the Rahman and Rahim, you have made us all Pakistanis proud and happy. Long live Pakistan-Iran friendship. Thank you for sending the pictures of that great event in your life that you will

always remember. You look so bright and impressive as you are in the pictures.
With best wishes and prayers for a successful and healthy life in future.
Ali Raza Naqvi

(تمہاری اس عظیم کامیابی پر اپنی اور اپنے گھر والوں کی طرف سے، تمہیں اور تمہارے سب گھر والوں کو بہترین اور دل کی گہرائیوں سے تبریکات۔ اللہ رحمان اور رحیم کا شکر کہ تم نے ہم سب پاکستانیوں کو سربلند اور شاد کیا۔ پاکستان ایران دوستی زندہ باد۔ اس بات پر بھی شکریہ کہ تم نے اپنی زندگی کے اس عظیم موقعے کی، جسے تم ہمیشہ یاد رکھو گے، تصاویر مجھے بھیجیں۔ تم تصاویر میں بھی بہت نمایاں اور متاثر کن دکھائی دے رہے ہو۔ مستقبل میں کامیاب اور صحت مند زندگی کی خواہشات اور دعاوں کے ساتھ۔ علی رضا نقوی)

۲۰۱۳ء میں مرکز تحقیقات فارسی کے ایک ٹائپ نویس مرتضی علی کا اچانک انتقال ہوگیا جسے ڈاکٹر صاحب اچھی طرح جانتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں مرتضی کی وفات کی خبر دی تو انھوں نے ایک طویل تعزیت نامہ مجھے بھیجا۔ اس میں ایک تجویز بھی تھی کہ پاکستان میں تمام ایرانی مراکز کو اپنے اس طرح کے ملازمین کے لیے رفاہی فنڈ قائم کرنا چاہیے۔ جو پاکستانی اساتذہ یا فارسی کتب کے ناشرین ایرانی حکومت سے اپنی کتابوں پر نقد انعام پاتے ہیں وہ بھی اپنے انعام کا کچھ حصہ اس فنڈ میں دیں۔ اگر مرکز یا رایزنی یہ قدم اٹھائے تو ابھی سے وہ اپنی طرف سے مبلغ دس ہزار روپے کا عطیہ اس فنڈ میں جمع کرانے کے لیے تیار ہیں تاکہ مرتضی کی بیوہ اور بچوں کی بروقت امداد ہو سکے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تجویز عمل پذیر نہ ہو سکی لیکن ان کی خیر خواہی بالکل عیاں تھی۔

۹/ مارچ ۲۰۱۴ء کو جب میں محکمۂ تعلیم عالیہ پنجاب کی طرف سے گورڈن کالج، راول پنڈی میں ملازمت سے سبک دوش ہوا تب بھی ڈاکٹر صاحب کینیڈا میں تھے۔ میں نے انھیں اپنی سبک دوشی کی اطلاع دی تو اللہ سبحانہ وتعالی کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے میری باعزّت ریٹائرمنٹ قرار دیا اور میرے لیے آگے کامیاب، با آرام اور متحرک زندگی کی دعا کی۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تینوں دعائیں مستجاب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ وہ عیدین کے موقع پر خود مجھے فون کرتے، عید کی مبارک باد کہتے، اہل خانہ کی خیریت دریافت کرتے۔ بچوں کا پوچھتے کہ کیا پڑھتے اور کیا کرتے ہیں، ان کی شادی ہوئی یا نہیں؟۔ مجھ سے میری علمی مشغولیت کا سوال کرتے۔ ایران اور ہندوستان میں مشترکہ دوستوں بالخصوص ڈاکٹر سید حسن عباس کی خیریت دریافت کرتے اور ڈھیر ساری نیک تمناوں اور دعاوں کے ساتھ فون بند کر دیتے۔ مجھے شرمندگی ہوتی کہ عید کے موقع پر مجھے فون کرنا چاہیے تھا لیکن وہ پہل کر جاتے۔ **الفضل للمتقدمین**۔

جس زمانے میں ڈاکٹر صاحب تہران میں مقیم تھے، فرانسیسی کمپنی BIC کے بنائے ہوئے بال پوائنٹ استعمال کرتے تھے۔ یہ بال پوائنٹ کئی دہائیوں سے اب بھی ایران میں استعمال ہوتے چلے آرہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے پسندیدہ

تھے۔ جب بعد کے زمانوں میں میرا ایران آنا جانا شروع ہوا تو ڈاکٹر صاحب فرمائش کر کے ایران سے اپنے لیے بِک کے بال پوائنٹ منگواتے۔ میں کئی اسفار میں ان کی یہ چھوٹی سی فرمائش پوری کر کے بہت بڑی خوشی حاصل کرتا رہا۔

مجھے تو یاد نہیں ہے لیکن میری اہلیہ نے یاد دلایا کہ بہت پہلے ایک بار ڈاکٹر صاحب ہمارے مکان (۶۹ ماڈل ٹاون، ہمک) پر تشریف لائے تھے اور بڑی شفقت اور اپنائیت سے گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ ویسے تو کئی بار ڈاکٹر صاحب کی اسلام آباد میں اقامت گاہ (مکان ۲۲۷، گلی ۳۲، سیکٹر جی/ ۸-۲) پر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا لیکن ایک بار ڈاکٹر صاحب نے میری اہل خانہ سمیت اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ وہ میری اہلیہ کو اپنی آبائی تہذیب کے مطابق ''دلھن'' کہہ کر مخاطب کرتے اور جب بھی فون پر ان کا پوچھنا ہوتا، یوں پوچھتے: ''دلھن کیسی ہیں؟''

ڈاکٹر صاحب کو اپنے پرانے احباب کا خیال رہتا تھا۔ ۱۹۹۳ء میں وہ شیخ مفید کانفرنس میں شرکت کے لیے تہران گئے اور پورا ایک ہفتہ (۲۲ تا ۲۸ اپریل) وہاں قیام کیا۔ اتفاق سے ان دنوں میں بھی بسلسلۂ تعلیم تہران ہی میں مقیم تھا۔ میں یہ تمام وقت ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ ان کی خدمت میں رہا۔ انھوں نے اپنے چند پرانے دوستوں کا ذکر کیا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ جو ہنوز زندہ تھے ان سے براہ راست مل لیا اور جو مرحوم ہو چکے تھے ان کے خاندان والوں سے ملے۔ یہ غالباً ۱۹۶۴ء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی پرانے دوستوں سے پہلی تجدیدِ ملاقات تھی۔ چناں چہ میں نے انھیں ڈاکٹر علی نقی منزوی مرحوم، احمد منزوی مرحوم، ڈاکٹر حسن سادات ناصری مرحوم کے خاندان، ڈاکٹر حسین گونیلی مرحوم کے خاندان، رمضان صلاح الصاوی مرحوم[۱۰]، ڈاکٹر مظاہر مصفا اور ڈاکٹر مہدی محقق وغیرہ سے ملوایا۔ ہندوستان سے ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب (موجودہ ڈائریکٹر رضا لائبریری رام پور) سے بھی ملوایا جو ان ایام میں تہران میں رہتے تھے اور میر غلام علی آزاد بلگرامی پر کام کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کی کتاب تذکرہ نویسی سے بھرپور استفادہ کر چکے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے غائبانہ مدّاح تھے۔

ڈاکٹر صاحب قیام تہران (۱۹۵۶-۱۹۶۳ء) کے دوران انگریزی اخبار ''تہران جرنل'' میں کام کر چکے تھے۔ ۱۹۹۳ء میں یہ اخبار ''تہران ٹائمز'' کے نام سے شائع ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنا پرانا دفتر دیکھنے کا شوق چرایا تو میں انھیں وہاں بھی لے گیا۔ اخبار کے ایڈیٹر کا دفتر چوتھی منزل پر تھا اتفاق سے ان دنوں اخبار کے ایڈیٹر اردو بولنے والے ایک پاکستانی تھے۔ ہم ہانپتے ہانپتے سیڑھیاں چڑھ کر چوتھی منزل پر ایڈیٹر صاحب تک پہنچے۔ بیٹھتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ایڈیٹر صاحب کو مخاطب کر کے یہ شعر پڑھا:

یہ کس رشکِ مسیحا کا مکاں ہے
زمین جس کی چہارم آسماں ہے

ایڈیٹر صاحب باذوق تھے، اس حسب حال شعر سے بہت محظوظ ہوئے۔

مرکز تحقیقات فارسی کے ایرانی مدیر قہرمان سلیمانی نے مرکز کی ادارت سنبھالتے ہی ڈاکٹر صاحب کی علمی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک جشن نامہ تیار کر کے ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں نے اس کے لیے اپنے احباب سے مقالات جمع کیے اور ۱۵ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ڈاکٹر صاحب کے علمی آثار کی فہرست مرتّب کرنے اور ان سے ذاتی حالات معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر واقع اسلام آباد گیا۔ ان کی تمام تصانیف و تراجم کے سرورق کی تصاویر بنائیں اور تقریباً بیس منٹ کا ایک صوتی مصاحبہ محفوظ کیا۔ فروری ۲۰۱۴ء میں سلیمانی صاحب کے واپس ایران چلے جانے کے باعث جشن نامے کی ترتیب و اشاعت کی بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اس جشن نامے کی تیاری ڈاکٹر صاحب کے علم میں تھی لیکن انھوں نے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا اور نہ ہی مجھ سے پوچھا کہ اس کا انجام کیا ہوا؟ اس سے ڈاکٹر صاحب کا خودنمائی سے گریز اور اخفاپسندی کا تاثر ملتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے گھر پر میں نے ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب دیکھ رکھا تھا جو اکثر و بیشتر ایرانی کتب پر مشتمل تھا۔ کتب کی کثرت اور جگہ کی قلت کے باعث ان کتابوں کی نگہداشت اچھی طرح نہیں ہو پا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی اس بارے میں تشویش رکھتے تھے۔ میں نے انھیں کتابیں کسی مناسب لائبریری کو عطیہ کر دینے کا مشورہ دیا اور ملک کے تین کتب خانوں کے نام تجویز کیے: ادارۂ تحقیقات اسلامی، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان اور مسعود جھنڈیر لائبریری، سردار پور جھنڈیر۔ آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی کتب تین حصوں میں تقسیم کریں گے۔ چناں چہ ۲۰۱۶ء میں ایک حصہ جو مذہبی کتب پر مشتمل تھا جامعہ صادق، اسلام آباد کو دیا، عربی ادب کی کتب ادارۂ تحقیقات اسلامی کو اور فارسی ادب پر کتب مرکز تحقیقات فارسی کو عطیہ کر دیں[11]۔

۲۰۰۰ء سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیٹوں سلمان رضا نقوی اور عدنان رضا نقوی کے پاس کینیڈا جانا اور وہاں رہنا شروع کیا۔ وہ قانون کے مطابق چند ماہ وہاں گذارتے اور واپس اسلام آباد آ جاتے اور پھر کینیڈا چلے جاتے۔ وہ مجموعی طور پر دس سال کینیڈا میں رہے۔ اس دوران وہ حسب ضرورت ای میل کے ذریعے مجھ سے رابطہ رکھتے۔ ان کے تمام برقی خطوط میرے پاس محفوظ ہیں، جن سے ان کی شفقت، محبت اور دوردَستوں کو یاد رکھنے کا وصف عیاں ہے۔ آخری بار وہ ۶ ستمبر ۲۰۱۵ء کو کینیڈا سے واپس وطن آئے اور اپنے منجھلے بیٹے برگیڈیئر عمران رضا نقوی کے پاس کھاریاں اور بعد میں مستقل لاہور میں رہنے لگے۔ اپنی پنشن لینے اور اسلام آباد والے گھر کی دیکھ ریکھ کے لیے وہ جب لاہور سے اسلام آباد کا قصد کرتے تو کبھی کبھار مجھے پیشگی اطلاع کر دیتے اور ان سے ملاقات ہو جاتی۔ انھوں نے آخری بار ۱۴۳۹ ہجری کا ماہ محرّم (اکتوبر ۲۰۱۷ء) شروع ہونے پر مجھے لاہور سے فون کیا کہ وہ اسلام آباد آ رہے ہیں اور عاشورا کے ایام میں اسلام آباد میں رہیں گے، میں ان سے مل لوں۔ وائے افسوس کہ میں نے اس ملاقات کو کسی اگلے وقت پر ٹال دیا جو اب کبھی نہیں آئے گا۔

غنیمتی شمر ای شمع وصلِ پروانه
که این معامله تا صبحدم نخواهد ماند
(حافظ)

(اے شمع! پروانے کے وصل کو غنیمت جانو، یہ معاملہ صبح ہونے تک نہیں رہے گا۔)

حواشی وتعلیقات:

۱۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کا واقعہ ان کے بیٹے بریگیڈیئر عمران رضا نقوی صاحب نے مجھ سے اس طرح بیان کیا کہ وہ ۹ دسمبر کی عصر کو حسب معمول لاہور کینٹ کے گولف کلب میں سیر کو گئے تھے۔ عمران نقوی اور ان کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو وہاں کا منظر اور سیر کے لیے وہ جگہ بے حد پسند تھی۔ اس روز چلتے چلتے وہ تھک کر اچانک ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور وہ کچھ بول بھی نہیں پا رہے تھے۔ کچھ دیر یہی کیفیت رہی اور وہیں بیٹھے بیٹھے ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ انھیں لاہور چھاؤنی کے کیولری گراونڈ کے شہدا قبرستان میں دفن کیا گیا۔

۲۔ عبدالعلی ادیب برومند، خلاصة الاشعار و زبدة الافکار (بخش کاشان) تالیف میر تقی الدین کاشانی، تہران، میراث مکتوب، ۲۰۰۵ء، مقدمہ، ص ۲۷

۳۔ سید با حیدر شہریار نقوی (۱۹۲۴-۱۹۸۰ء)، پاکستان سے اعلیٰ تعلیم کے لیے تہران یونیورسٹی گئے اور بعد میں وہیں کے ہو کر رہ گئے اور ایران ہی میں شادی اور انتقال کیا۔ پہلے تہران یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے رہے۔ پھر اصفہان یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کر کے وہاں تدریس کی۔ انھوں نے فرہنگ اردو فارسی بھی تالیف کی جو پاکستان (۱۹۹۱ء، ۱۹۹۳ء) اور ایران (۱۹۹۴ء) سے شائع ہو چکی ہے۔

۴۔ آگے چل کر ڈاکٹر آفتاب اصغر (۱۹۴۰-۲۰۱۵ء) جب تہران یونیورسٹی گئے تو انھوں نے ۱۹۷۲ء میں برّعظیم میں فارسی تاریخ نویسی پر کام کیا۔ ان کا مقالہ تاریخ نویسی فارسی در ہند و پاکستان (لاہور، ۱۹۸۵ء) مغلیہ دور (بابر تا اورنگ زیب عالمگیر) میں فارسی تاریخ نویسی پر محیط ہے۔ اس طرح حافظ محمود شیرانی نے جن تین بڑے موضوعات پر کام کرنے کی نشان دہی کی تھی، تین پاکستانی طالب علموں نے ایران جا کر کم و بیش اس کو نبھا دیا۔ اگرچہ ان تینوں موضوعات پر تکمیلی نوعیت کے کام کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔ میں ڈاکٹر نقوی صاحب کو ان کی کتاب تذکرہ نویسی کا تکملہ لکھنے یا اس کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن لانے کے لیے گاہے بہ گاہے درخواست کرتا رہتا تھا، لیکن وہ یہ میدان چھوڑ چکے تھے اور اس طرف ملتفت نہ ہوئے۔ مشفق خواجہ مرحوم کو بھی ڈاکٹر صاحب سے یہی ''گلہ'' رہا کہ کاش ڈاکٹر صاحب فارسی ادب کے میدان میں ہی رہتے۔ ان کی کتاب تذکرہ نویسی کو شائع ہوئے اب نصف صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے۔ اس دوران نہ صرف کئی نئے تذکرے (بطور مثال حدیقۂ ہندی) دستیاب ہوئے جو تذکرہ نویسی میں شامل نہیں ہیں بلکہ متعدد تذکروں کی تنقیدی اشاعتیں ہو چکی ہیں جن کی روشنی میں تذکرہ نویسی پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۵۔ فارسی شعرا کے تذکروں کی تاریخ پر کام میں ڈاکٹر علی رضا نقوی صاحب کو اولیّت حاصل ہے۔ بعد میں ایرانی محقق احمد گلچین معانی (۱۹۱۶-۲۰۰۰ء) کی تاریخ تذکرہ ہای فارسی دو جلدوں میں منظر عام پر آئی (تہران، ۱۹۶۹-۱۹۷۱ء) جو اپنے موضوع پر بہت عمدہ کام ہے۔ اس میں کہیں کہیں ڈاکٹر صاحب کے کام پر تعریض بھی کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۲۶-۲۰۱۳ء) کی کتاب

اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری (کراچی، ۱۹۹۸ء طبع دوم) بنیادی طور پر اردو شاعروں کے تذکروں سے متعلق ہے لیکن اس میں اردو شعرا کے وہ تذکرے بھی شامل ہوئے ہیں جو فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

۶۔ پاکستان کے چند اور محققین کو فارسی ادب پر مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایرانی حکومت کی طرف سے ''نشان سپاس'' ملتے رہے ہیں یا تہران یونیورسٹی کی طرف سے اعزازی ڈاکٹریٹ دی گئی یا دیگر اداروں (جیسے بنیاد موقوفات دکتر محمود افشار، جشنوارۂ بین المللی فارابی) کی طرف سے اعزازات دیے گئے۔ اس وقت مولوی محمد شفیع، پیر حسام الدین راشدی، ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی، ڈاکٹر غلام سرور، ڈاکٹر عبدالشکور احسن، ڈاکٹر ظہور الدین احمد اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے نام ذہن میں آرہے ہیں جن کی خدمات کا اعتراف ایران میں کیا گیا ہے۔ جہاں تک کتابی تحقیق پر سالانہ مقابلے میں بہترین ''عالمی کتاب سال ایوارڈ'' کا تعلق ہے، ڈاکٹر علی رضا نقوی کے بعد دو پاکستانیوں کی تحقیقات کو یہ اعزاز مل چکے ہیں۔ ۲۰۱۳ میں ڈاکٹر انجم حمید کو ان کی کتاب مخزن الاسرار نظامی گنجوی و استقبال آن در شبه قاره و ایران (اسلام آباد، ۲۰۱۱ء) اور ۲۰۱۴ء میں راقم السطور (عارف نوشاہی) کو کتا بشناسی آثار فارسی چاپ شده در شبه قاره (تہران ۲۰۱۲ء) پر۔ دل چسپ نکتہ یہ ہے کہ ایران میں مسلسل تین سال ۲۰۱۲، ۲۰۱۳ اور ۲۰۱۴ء میں یہ اعزاز پاکستانیوں کو حاصل ہوتا رہا جس کی بازگشت پاکستانی ذرائع ابلاغ میں کم ہی سنائی دی!

۷۔ کچھ اشاعتوں کی تفصیل کے لیے دیکھیے: عارف نوشاہی، کتاب شناسی آثار فارسی چاپ شده در شبه قاره، تہران، ۲۰۱۲ء، ج ۲، ص ۵۴-۱۰۵۵

۸۔ عارف نوشاہی، درس ہاے فارسی، کلاس دوم (غیر مطبوعہ)، ص ۱۲۵، ۱۹۱، ۲۲۰

۹۔ ۱۹۷۱ء سے لے کر اب تک میں کئی پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی اساتذہ سے مل چکا ہوں جو دانشگاہ تہران کے فارغ التحصیل ہیں لیکن ان کی تحریر اور تقریر میں ایرانی رنگ نہیں ہے۔ ان کی تحریر کا اسلوب ہو یا تقریر کا لہجہ، خود ''سبک ہندی'' ہونے کا اعلان کر رہا ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہاں بات ایرانی لہجے میں مہارت کی ہو رہی ہے۔ میں نے شعبۂ فارسی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے استاد سید وزیر الحسن عابدی (۱۹۱۴-۱۹۷۹ء) کو نہ دیکھا نہ سنا، لیکن ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جدید لہجے کی ایرانی فارسی بہت عمدہ بولتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر آفتاب اصغر میں بھی وہی خوبی پائی جاتی تھی۔ انھیں تو کئی بار سنا ہے۔ ایران سے فارغ التحصیل ہونے والی نئی پاکستانی نسل میں ڈاکٹر فائزہ زہرا میرزا (شعبۂ فارسی، جامعہ کراچی) عمدہ ایرانی لہجے کی فارسی بولتی ہیں۔ ایرانی لہجے کے ساتھ ساتھ جدید اور رائج الوقت ایرانی محاورات کا استحضار اور استعمال اضافی خوبی ہے۔

۱۰۔ رمضان صلاح الصاوی مصری شاعر اور دانشور تھے۔ مصر کے صدر جمال عبدالناصر (عہد صدارت: ۱۹۵۴-۱۹۷۰ء) کی پالیسیوں سے تنگ آکر مصر چھوڑ چکے تھے۔ گذشتہ تیس چالیس سال سے تہران میں مقیم تھے۔ عربی لہجے میں فارسی بولتے تھے۔ علامہ اقبال کی شاعری کا عربی ترجمہ کیا تھا۔ بہت اچھے عربی شاعر تھے۔ کئی پرانے پاکستانی طالب علموں نے دانشگاہ تہران میں ان سے عربی پڑھی ہے۔ ڈاکٹر علی رضا نقوی نے ان سے شیعہ فقہ پر کوئی عربی کتاب تلفظ کی درستی کے لیے زمانۂ طالب علمی میں پڑھی تھی۔ جس روز ہم ان سے ملنے گئے وہ شدید بیمار تھے اور ایک کھولی میں یک و تنہا پڑے ہوئے تھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ آفتاب لبِ بام آچکا ہے۔ چناں چہ وہی ہوا، ڈیڑھ سال بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۹۴ کو غربت در غربت، ارزروم ترکی میں انتقال کیا۔ غریب الوطنی میں بھی اپنی سفید پوشی اور وضع داری کا بھرم قائم رکھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نقوی کو وقتِ رخصت عطر میں بھیگا روئی کا بُرّا (پنبہ) پیش کیا اور کہا مہمان کو تحفہ دینا چاہیے خواہ وہ خوشبو کی مہک ہو۔ میں قیام تہران کے دوران جس ادارے (بنیاد دائرۃ المعارف اسلامی) میں جز وقتی کام کرتا

تھا استاد صلاح الصاوی اس کے دیوار بہ دیوار ہمسائے میں واقع انجمن فلسفہ وحکمت اسلامی کے کوارٹرز میں رہتے تھے اور گاہ بگاہ ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ زندگی درویشانہ تھی لیکن علمی صلابت موجود تھی۔

۱۱۔ کتب خانۂ گنج بخش مرکز تحقیقات فارسی میں مطبوعہ کتب کے اندراج کے مہتمم محمد صفدر صاحب نے بتایا کہ ۲۰۱۶ء میں ڈاکٹر صاحب نے ان کو اپنے گھر اسلام آباد میں بلوایا اور تمام کتب کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے کہا۔ محمد صفدر الماری سے کتاب نکال کر ڈاکٹر صاحب کو دکھاتے اور ڈاکٹر صاحب کہتے کہ فلاں حصّے میں رکھ دو۔ چناں چہ مرکز تحقیقات فارسی کے حصے میں کل ایک ہزار ایک سو چالیس [۱۱۴۰] نسخے (بشمول کتب و جرائد) آئے۔ جامعہ صادق کے حصے میں آنے والی کتب اس سے کم اور ادارۂ تحقیقات اسلامی کے حصے میں آنے والی کتب اس سے بھی کم تر تھیں۔ کتب حوالہ بشمول فرہنگیں اور وہ کام جو ابھی زیر تالیف تھے ان سے متعلق کتب ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر میں ہی رکھیں جو بقول محمد صفدر اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ یہ کتب تادمِ تحریر ان کے گھر میں ہی پڑی ہیں۔ مرکز تحقیقات فارسی کے کتاب خانۂ گنج بخش میں ڈاکٹر صاحب کی عطیہ کردہ صرف ۳۷۸ کتب داخل کی گئیں (شمارۂ اندراج ۴۸۵۴۰-۴۸۹۱۸) باقی ۱۰۶۲ کتب اور جرائد چوں کہ مکرّر تھے، انھیں تقسیم اور تبادلے کے لیے الگ رکھ دیا گیا ہے۔

مآخذ:

یہ مضمون اپنی ذاتی یادداشتوں، ذہنی محفوظات، ڈاکٹر صاحب کے بیٹے سلمان رضا نقوی سے برقی مراسلت اور ڈاکٹر صاحب کی تعزیتی تقریب منعقدہ ۲۶ دسمبر ۲۰۱۷ء باہتمام ادارۂ فروغ قومی زبان، اسلام آباد میں پڑھے گئے مقالات سے اخذ معلومات کے علاوہ مندرجہ ذیل تحریری مواد کی مدد سے تیار کیا گیا ہے:

عارف نوشاہی، ''نقوی، علی رضا''، مشمولہ: دانش نامۂ ادب فارسی (ادب فارسی در شبه قاره: هند، پاکستان، بنگلادیش) بخش سوم: غ-ی، به سرپرستی حسن انوشه، تهران، ۱۳۸۰ شمسی [۲۰۰۱ء]

علی رضا نقوی، ''پیشگفتار'' مشمولہ: تذکر منویسی فارسی در ہندو پاکستان، تہران، مؤسسہ مطبوعاتی علمی، ۱۹۶۴ء، صفحہ ۱۷-۱۹

علی رضا نقوی، "Preface to the second edition" مشمولہ: فرہنگ جامع فارسی به انگلیسی و اردو، اسلام آباد، رایزنی فرہنگی سفارت جمہوری اسلامی ایران، اشاعت دوم، ۲۰۰۳ء

علی رضا نقوی، خلاصۂ شرح حال دکتر علی رضا نقوی، ڈاکٹر صاحب کا خود تیار کردہ کوائف نامہ بزبان فارسی (غیر مطبوعہ) جس میں بعض سنین غلط کتابت ہوئے ہیں اور قیاس سے ان کی درستی کی گئی ہے۔

نیز دیکھیے:

آئینۂ حقیقت، سید امان علی نقوی شجر، کراچی، ۲۰۰۰ء، (ڈاکٹر نقوی کے جدّ اعلیٰ شاہ ولایت مخدوم سید شرف الدین کے حالات کے لیے۔)

تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء، پانچویں جلد (فارسی ادب: سوم) ص ۶۷۷-۶۷۸

ثمرات القدس من شجرات الانس از میرزا لعل بیگ لعلی بدخشی (۹۶۸-۱۰۲۲ھ)، مقدمہ، تصحیح و تعلیقات سید کمال حاج سید جوادی، پژوہشگاہ علوم انسانی و مطالعات فرہنگی، تہران، ۱۹۹۷ء، ص ۶-۷۹، یہ غالباً برّ عظیم کا پہلا فارسی مأخذ ہے جس میں ڈاکٹر علی رضا نقوی کے جدّ اعلیٰ شاہ ولایت مخدوم سید شرف الدین کے حالات درج ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں امروہہ اور شاہ ولایت کے اخلاف سے دیگر سادات کا تذکرہ بھی ہوا ہے۔

سبط حسن رضوی، ''فارسی در شبہ قارہ پس از سال ۱۳۲۶ خ (سال تجزیہ)''، ترجمۂ مریم ناطق شریف، نامۂ پارسی، تہران، سال

پنجم، شمارۂ ۳، پاییز ۱۳۷۹ ش [۲۰۰۰ء]، ص ۱۱۶
فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ از محمد صدیق شبلی و محمد ریاض، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۴ء، ص ۲۹۹
فارسی پاکستانی و مطالب پاکستان شناسی از محمد حسین تسبیحی، راول پنڈی، مصنف، ۱۹۷۴-۱۹۷۷ء، ج ۱، ص ۱۵۷- ۱۵۸؛ ج ۲، ص ۳۶۵-۳۶۷
گنج شایگان از محمد مہدی ناصح، تہران، دبیر خانہ شورای گسترش زبان و ادبیات فارسی، ۱۳۷۴ ش [۱۹۹۵ء]، ص ۱-۷۲
ماہ نامہ مجلہ، کراچی، انجمن سادات امروہہ، مارچ-اپریل ۱۹۶۶ء، جلد ۱، شمارہ ۹، ص ۲۲-۲۳
مجموعۂ سخنرانی ہای نخستین سمینار پیوستگی ہای فرہنگی ایران و شبہ قارہ، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ج ۱، ص ۳۵۶-۳۵۷
https://en.wikipedia.org/wiki/Amrohi_Syed

Abstract

It is full of reminiscences of the article writer about Syed Ali Raza Naqvi replete with the pioneering scholarship of the later. The very aspect of the article has many relevant references to cite on account of Mr Naqvi's lexicography and his meticulous research on tazkira navisi in the sub-continent carried out in Persian language. Mr Naqvi is also reckoned to produce many tutorial texts for the non-native learners of Persian language in Pakistan. It is an unfortunate episode of the Pakistan media response to those scholars whose works have been recognized in Iran as the best book of the year but the Pakistani audience knows nothing about them. It is an interesting fact that the works of Pakistani researchers were recognized best in Iran in three consecutive years: 2012, 2013 and 2014. The writer of this article, Dr Anjum Hameed and Mr Naqvi were among those recognized through aalmi kitab saal award.

Keywords: Persian lexicography in sub-continent, tazkira navisi, Shiite studies